ونے: اندو سے ملنے جانا ہے۔

جانہوی: کوئی ضرورت نہیں۔ ملنے کا رواج عورتوں کے لیے ہے۔ مردوں کے لیے نہیں۔ جاؤ۔

ونے کو پھر کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آہستہ سے اٹھے اور چلے گئے۔

صوفی نے ہمت کر کے کہا۔ ''آج کل تو راجپوتانہ میں آگ برستی ہوگی۔''

جانہوی نے طے شدہ انداز سے کہا: ''فرض کو کبھی آگ اور پانی کی پروا نہیں ہوتی۔ جاؤ۔ تم بھی سو رہو۔ سویرے اٹھنا ہے۔''

صوفی ساری رات بیٹھی رہی۔ ونے سے ایک بار ملنے کے لیے اس کا دل چھٹ پٹا رہا تھا۔ آہ وہ کل چلے جائیں گے اور میں ان سے الوداعی ملاقات بھی نہ کر سکوں گی! وہ بار بار کھڑکی سے جھانکتی کہ کہیں ونے کی آہٹ مل جائے۔ چھت پر چڑھ کر دیکھا۔ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ستارے اس کی بے قراری پر ہنس رہے تھے۔ اس کے دل میں کئی بار زبردست تحریک ہوئی کہ چھت پر سے نیچے باغ میں کود پڑوں۔ ان کے کمرہ میں جاؤں اور کہوں میں تمہاری ہوں! آہ اگر مذہب نے میرے اور ان کے درمیان میں رکاوٹ نہ کھڑی کر دی ہوتی تو وہ اتنے متفکر کیوں ہوتے؟ مجھ کو اتنا پس و پیش کیوں ہوتا؟ رانی مجھ سے بے رخی کیوں کرتیں؟ اگر میں راجپوتنی ہوتی تو رانی خوشی سے مجھ کو قبول کرتیں۔ مگر میں یسوع کی مقلد ہونے کی وجہ سے قابل ترک ہوں۔ یسوع اور کرشن میں کتنی یکسانیت ہے، لیکن ان کے مقلدوں میں کتنا اختلاف! کیسی زبردستی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مذہبی اختلافات نے ہمارے دلوں پر کتنا ظلم کیا ہے۔

جوں جوں رات گزرتی تھی۔ صوفی کا دل فرطِ یاس سے بیٹھا جاتا تھا۔ ہائے! میں یونہی بیٹھی رہوں گی اور سویرا ہو جائے گا۔ ونے چلے جائیں گے۔ کوئی ایسا بھی تو نہیں جس کے ہاتھوں ایک خط لکھ کر بھیج دوں۔ میرے ہی سبب سے تو ان کو یہ سزا مل رہی ہے۔ ماں کا دل بھی بے رحم ہوتا ہے۔ میں سمجھتی تھی میں ہی بدنصیب ہوں، پر

اب معلوم ہوا ایسی مائیں اور بھی ہیں۔

وہ چھت پر سے اتری اور اپنے کمرہ میں جا کر لیٹ رہی۔ مایوسی نے نیند کی گود میں پناہ لی، لیکن فکر کی نیند حالت گرسنگی کا کھیل ہے۔ سکون سے بری اور لذت سے خالی۔ ذرا سی دیر سوئی تھی کہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ سورج کا اجالا کمرہ میں پھیل گیا تھا اور ونے سنگھ اپنے بیسیوں ہمراہیوں کے ساتھ اسٹیشن جانے کو تیار کھڑے تھے۔ باغ میں ہزاروں آدمیوں کا ہجوم تھا۔

وہ فوراً باغ میں جا پہنچی اور مجمع کو ہٹاتی ہوئی مسافروں کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ قومی گیت گایا جا رہا تھا۔ مسافر ننگے سر، ننگے پیر۔ ایک ایک کرتہ پہنے۔ ہاتھ میں لاٹھی لیے۔ گردنوں میں ایک ایک جھولی لٹکائے۔ سفر کو جانے کے لیے تیار تھے۔ سب کے سب خوشی اور جوش سے بھرے ہوئے قومیت کے غرور سے بے خود ہو رہے تھے، جن کو دیکھ کر تماشائیوں کے دل جذبۂ افتخار سے معمور تھے۔ ایک لمحہ بعد رانی جانہوی آئیں اور مسافروں کی پیشانیوں پر زعفران کے قشقے لگائے۔ پھر کنور بھرت سنگھ نے آ کر ان کے گلوں میں ہار پہنائے۔ ازاں بعد ڈاکٹر گنگولی نے نہایت منتخب الفاظ میں ان کو اپنا وعظ سنایا۔ وعظ سن کر جانے والے روانہ ہو گئے۔ جے جے کا نعرہ ہزار ہزار گلوں سے نکل کر فضا میں گونجنے لگا۔ عورتوں، مردوں کا ایک مجمع ان کے پیچھے چلا۔ صوفیہ بت بنی ہوئی یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل میں رہ رہ کر امنگ اٹھتی تھی کہ میں بھی انہیں کے ساتھ چلی جاؤں اور اپنے دکھی بھائیوں کی خدمت کروں۔ اس کی آنکھیں ونے سنگھ پر لگی ہوئی تھیں۔ دفعتاً ونے کی آنکھیں بھی اس کی جانب پھریں۔ انہیں کتنی مایوسی تھی۔ کتنی باطنی تکلیف۔ کتنی مجبوری۔ کتنی عاجزی۔ وہ سب جانے والوں کے پیچھے جا رہا تھا۔ بہت آہستہ آہستہ جیسے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہوں۔ صوفیہ ہوش اور بے ہوشی کی حالت میں مسافروں کے پیچھے پیچھے چلی اور اسی طرح سڑک پر جا پہنچی۔ پھر چوراہا ملا۔ اس کے بعد کسی راجہ کا عظیم الشان محل۔ پر ابھی تک صوفی کو خبر نہ ہوئی کہ میں ان کے ساتھ چلی جا

رہی ہوں۔ اس کو اس وقت و نے سنگھ کے سوا اور کوئی نظر ہی نہ آتا تھا۔ کوئی زبردست کشش اسے کھینچے لیے جا رہے تھی۔ یہاں تک کہ وہ اسٹیشن کے سامنے والے چوراہے پر پہنچ گئی۔ دفعتاً اس کے کانوں میں پربھوسیوک کی آواز پڑی جو بڑی تیزی سے فٹن دوڑائے چلے آ رہے تھے۔

پربھوسیوک نے پوچھا۔ ''صوفی! تم کہاں جا رہی ہو؟ جوتے تک نہیں۔ صرف زیر پائیاں پہنے ہوئے ہو۔''

صوفیہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ آہ۔ میں اس بھیس میں کہاں چلی آئی۔ مجھے سدھ ہی نہ رہی۔ لجاتی ہوئی بولی۔ ''کہیں تو نہیں۔''

پربھوسیوک: کیا ان لوگوں کے ساتھ اسٹیشن تک جاؤ گی؟ آؤ! گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ میں بھی وہیں چلتا ہوں۔ مجھے تو ابھی ابھی معلوم ہوا کہ یہ لوگ جا رہے ہیں۔ جلد ہی گاڑی تیار کرا کے آ پہنچا، ورنہ ملاقات بھی نہ ہوتی۔

صوفی: میں اتنی دور نکل آئی اور ذرا بھی خیال نہ آیا کہ کہاں جا رہی ہوں۔

پربھوسیوک: آ کر بیٹھ نہ جاؤ۔ اتنی دور آئی ہو تو اسٹیشن تک اور چلی چلو۔

صوفی: میں اسٹیشن نہ جاؤں گی۔ یہیں سے واپس ہوں گی۔

پربھوسیوک: میں اسٹیشن سے واپسی پر آؤں گا۔ آج تمہیں میرے ساتھ گھر چلنا ہوگا۔

صوفی: میں وہاں نہ جاؤں گی۔

پربھوسیوک: بڑے پاپا بہت ناراض ہوں گے۔ آج تم کو انہوں نے بہت اصرار کے ساتھ طلب کیا ہے۔

صوفی: جب تک ماما خود آ کر مجھے نہ لے جائیں گی، اس وقت تک میں قدم نہ رکھوں گی۔

یہ کہہ کر صوفیہ لوٹ پڑی اور پربھوسیوک اسٹیشن کو چل دیئے۔

اسٹیشن پر پہنچ کر و نے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ صوفی نہ تھی۔

پربھوسیوک نے ان کے کان میں کہا۔ ''دھرم سالہ تک یوں ہی رات کے کپڑے پہنے چلی آئی تھی۔ وہاں سے لوٹ گئی۔ جا کر خط ضرور لکھیے گا ورنہ وہ راجپوتا نہ جا پہنچے گی۔''

و نے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''صرف جسم لے کر جا رہا ہوں۔ دل یہیں چھوڑے جاتا ہوں!''

(10)

لڑکوں پر محبت کی طرح نفرت کا اثر بھی زیادہ ہوتا ہے۔ جب سے مٹھو اور گھیسو کو معلوم ہوا تھا کہ طاہر علی ہمارا میدان زبردستی لے رہے ہیں۔ اس وقت سے دونوں ان کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ چتاری کے راجہ صاحب اور سورداس میں جو باتیں ہوئی تھیں، ان کا انہیں علم نہ تھا۔ سورداس کو خود بھی دغدغہ لگا ہوا تھا کہ اگر چہ راجہ صاحب نے اطمینان دلایا ہے مگر جلد ہی یہ مسئلہ پھر چھڑے گا۔ جان سیوک صاحب اتنی آسانی سے گلا چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ بجرنگی، نائیک رام وغیرہ بھی اسی قسم کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ مٹھو اور گھیسو یہ باتیں بڑی چاہ سے سنتے اور ان کی آتش غضب اور بھی مشتعل ہوتی۔ گھیسو جب بھینسیں لے کر میدان کی طرف جاتا تو زور زور سے پکارتا۔ ''دیکھیں کون ہماری جمین (زمین) لیتا ہے۔ اٹھا کر ایسا پٹکوں کہ وہ بھی یاد کرے۔ دونوں ٹانگیں توڑ دوں گا۔ کچھ کھیل سمجھ لیا ہے۔'' وہ ذرا تھا بھی کڑے دم کا۔ کشتی لڑتا تھا۔ بجرنگی خود بھی جوانی میں اچھا پہلوان تھا۔ گھیسو کو وہ شہر کے پہلوانوں کی ناک بنا دینا چاہتا تھا جس کے سامنے پنجابی پہلوانوں کو بھی خم ٹھونکنے کی ہمت نہ پڑے۔ دور دور جا کر دنگل مارے لوگ کہیں۔ ''یہ بجرنگی کا بیٹا ہے!'' وہ ابھی سے گھیسو کو اکھاڑے بھیجتا تھا۔ گھیسو اپنے زعم میں سمجھتا تھا کہ مجھے جو پیچ معلوم ہیں، ان سے جس کو چاہوں گرا دوں۔ مٹھو اکشتی تو نہ لڑتا پر کبھی اکھاڑے میں جا بیٹھتا تھا۔ اس کو اپنی پہلوانی کی ڈینگ مارنے کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ یہ دونوں جب طاہر علی کو کہیں دیکھتے تو سنا سنا کر کہتے۔ ''دشمن جاتا ہے۔ اس کا منہ کالا۔'' مٹھو اکہتا ہے۔''

جے شنکر۔ کانٹا لگے نہ کنکر۔'' دشمن کو تنگ کر۔ گھیسو کہتا۔ ''بم بھولا۔ بیری کے پیٹ میں گولا۔ اس سے کچھ نہ جانے بولا۔''

طاہر علی ان چھوکروں کی چھچھورپن کی باتیں سنتے اور ان سنی کر جاتے۔ لڑکوں کے منہ کیا لگیں۔ سوچتے۔ کہیں یہ سب گالیاں دے بیٹھیں تو ان کا کیا بنا لوں گا۔ وہ دونوں سمجھتے ڈر کے مارے نہیں بولتے اور بھی شیر ہو جاتے۔ گھیسو مٹھوا پر ان پیچوں کی آزمائش کرتا جن سے وہ طاہر علی کو پٹکے گا۔ پہلے یہ ہاتھ پکڑا پھر اپنی طرف کھینچا۔ تب وہ ہاتھ گردن میں ڈال دیا اور اڑنگی لگائی۔ بس چاروں شانے چت مٹھوا فوراً گر پڑتا تھا اور اس کو اس پیچ کے عجیب اثر کا یقین ہو جاتا تھا۔

ایک روز دونوں نے صلاح کی کہ چل کر میاں جی کے لڑکوں کی خبر لینی چاہیے۔ میدان میں جا کر طاہر اور جابر کو کھیلنے کے لیے بلایا اور خوب چپتیں لگائیں۔ جابر چھوٹا تھا۔ اسے مٹھوا نے دبایا۔ طاہر اور گھیسو کا جوڑ تھا، لیکن گھیسو اکھاڑہ دیکھے ہوئے تھا۔ کچھ داؤ پیچ جانتا ہی تھا۔ آن کی آن میں طاہر کو دبا بیٹھا۔ مٹھوا نے جابر کے چٹکیاں لینی شروع کیں۔ بیچارہ رونے لگا۔ گھیسو نے طاہر کو کئی رگڑے دیئے۔ وہ بھی چوندھیا گیا۔ جب دیکھا کہ یہ تو مار ہی ڈالے گا تو اس نے بھی پکار مچائی۔ ان دونوں کا رونا سن کر ننھا سا صابر ایک پتلی سی چھڑی لیے اکڑتا ہوا غم زدوں کی مدد کرنے آیا اور گھیسو کو چھڑی سے مارنے لگا۔ جب اس مار کا گھیسو پر کچھ اثر نہ ہوا تو اس نے اس سے زیادہ چوٹ پہنچانے والا ہتھیار نکالا۔ وہ گھیسو پر تھوکنے لگا۔ گھیسو نے طاہر کو چھوڑ دیا اور صابر کے دو تین طمانچے لگائے۔ طاہر موقع پا کر پھر اٹھا اور اب کے زیادہ ہوشیار ہو کر گھیسو سے لپٹ گیا۔ دونوں میں کشتی ہونے لگی۔ آخر گھیسو نے اسے پھر پٹکا اور مشکیں چڑھا دیں۔ طاہر کو اب رونے کے سوا اور تدبیر نہ سوجھی۔ یہ کمزوروں کا آخری ہتھیار ہے۔ تینوں کے رونے کی آواز ماہر علی کے کانوں میں پہنچی۔ وہ اس وقت مدرسہ جانے کو تیار تھے۔ فوراً کتابیں پٹک دیں اور میدان کی طرف دوڑے۔

دیکھا تو ظاہر اور جابر نیچے پڑے ہائے ہائے کر رہے ہیں اور صابر الگ رو رہا ہے۔ شرافت کا خون جوش میں آ گیا۔ میں سید پولیس کے افسر کا بیٹا۔ چنگی کے محرر کا بھائی۔ انگریزی کے آٹھویں درجہ کا متعلم! یہ جاہل، گنوار، اہیر کا لونڈا، اس کی اتنی مجال کہ میرے بھائیوں کو نیچا دکھائے۔ اس نے گھیسو کو ایک ٹھوکر لگائی اور مٹھوا کو کئی طمانچے، مٹھوا تو رونے لگا مگر گھیسو دل کا مضبوط تھا۔ ظاہر کو چھوڑ کر اٹھا۔ حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ دو مورچے سر کر چکا تھا۔ خم ٹھونک کر ماہر علی سے بھی لپٹ گیا۔ ماہر کا سفید پاجامہ میلا ہو گیا۔ آج ہی جوتے میں روغن لگایا تھا۔ اس پر گرد پڑ گئی۔ سنوارے ہوئے بال بکھر گئے۔ غضب ناک ہو کر گھیسو کو ایسی گردنی دی کہ دو قدم پر جا گرا۔ صابر ظاہر سب ہنسنے لگے۔ لڑکوں کی چوٹ بدلہ لینے کے ساتھ ہی غائب ہو جاتی ہے۔ گھیسو ان کو ہنستے دیکھ کر اور بھی جھنجلایا۔ پھر اٹھا اور ماہر سے لپٹ گیا۔ ماہر نے اس کا گلا پکڑا اور زور سے دبانے لگا۔ گھیسو نے سمجھا اب مرا۔ یہ مارے بغیر نہ چھوڑے گا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ماہر کے ہاتھ میں دانت جما دیئے۔ تین دانت گڑ گئے۔ خون بہنے لگا۔ ماہر چیخ اٹھا۔ اس کا گلا چھوڑ کر اپنا ہاتھ چھڑانے لگا۔ مگر گھیسو کسی طرح نہ چھوڑتا تھا۔ خون بہتا دیکھ کر تینوں بھائیوں نے پھر رونا شروع کیا۔ زینب اور رقیہ یہ شور و غوغا سن کر دروازہ پر آ گئیں۔ دیکھا تو میدان جنگ خون سے سرخ ہو رہا ہے۔ گالیاں دیتی ہوئی طاہر علی کے پاس گئیں۔ زینب نے حقارت آمیز آواز میں کہا۔ ''تم یہاں بیٹھے کھالیں نوچ رہے ہو۔ کچھ دین دنیا کی بھی خبر ہے؟ وہاں وہ اہیر کا لونڈا ہمارے بچوں کا خون کیے ڈالتا ہے۔ موئے کو پکڑ پاتی تو خون ہی پی لیتی۔''

رقیہ: موا آدمی کا بچہ ہے کہ دیو بچہ۔ ماہر کے ہاتھ میں اتنے زور سے دانت سے کاٹا ہے کہ خون کے فوارے نکل رہے ہیں۔ کوئی دوسرا مرد ہوتا تو اسی بات پر جیتا گاڑ دیتا۔

زینب: کوئی اپنا ہوتا تو اسی بات پر مونڈی کاٹے کو کچا ہی چبا جاتا۔

طاہر علی گھبرا کر میدان کی طرف دوڑے۔ ماہر کے کپڑے خون سے تر دیکھے تو جامہ سے باہر ہو گئے۔ گھیسو کے دونوں کان پکڑ کر زور سے ملے اور طمانچے پر طمانچے لگانے شروع کئے۔ مٹھو نے دیکھا اب پٹنے کی باری آئی۔ میدان ہمارے ہاتھ سے گیا۔ گالیاں دیتا ہوا بھاگا۔ ادھر گھیسو نے بھی گالیاں دینا شروع کیا۔ شہر کے لونڈے گالی دینے میں مشاق ہوتے ہیں۔ گھیسو نئی نئی گالیاں اختراع کر رہا تھا اور طاہر علی گالیوں کا جواب طمانچوں سے دے رہے تھے۔ مٹھو نے جا کر اس معرکہ کی خبر بجرنگی کو دی۔ ''سب لوگ مل کر گھیسو کو مار رہے ہیں۔ اس کے منہ سے لہو نکل رہا ہے۔ وہ بھینسیں چرا رہا تھا کہ تینوں لڑکے آ کر بھینسوں کو بھگانے لگے۔ گھیسو نے منع کیا تو سب نے مل کر مارا اور بڑے میاں بھی نکل کر مار رہے ہیں۔'' بجرنگی یہ خبر سنتے ہی آگ ہو گیا۔ اس نے طاہر علی کی ماں کو پچاس روپے دیئے تھے اور اس زمین کو اپنی سمجھے بیٹھا تھا۔ لاٹھی اٹھائی اور دوڑا۔ دیکھا تو طاہر علی گھیسو کے ہاتھ پاؤں بندھوا رہے ہیں۔ پاگل ہو گیا۔ بولا۔ ''بس منشی جی! بھلا چاہتے تو ہٹ جاؤ۔ نہیں تو ساری سیکھی (شیخی) بھلا دوں گا۔ یہاں جیل خانہ کا ڈر نہیں ہے۔ سال دو سال وہیں کاٹ آؤں گا۔ مگر تم کو کسی کام کا نہ رکھوں گا۔ زمین تمہارے باپ کی نہیں ہے۔ اس لیے تمہیں پچاس روپے دیئے ہیں۔ کیا وہ حرام کے روپے تھے؟ بس ہٹ ہی جاؤ۔ نہیں تو کچا چبا جاؤں گا۔ میرا نام بجرنگی ہے۔''

طاہر علی نے بھی ابھی کچھ جواب نہ دیا تھا کہ گھیسو نے باپ کو دیکھتے ہی زور سے چھلانگ ماری اور ایک پتھر اٹھا کر طاہر علی کی طرف پھینکا۔ وہ سر نیچا نہ کر لیں تو ماتھا پھٹ جائے۔ جب تک گھیسو دوسرا پتھر اٹھائے۔ انہوں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اتنے زور سے اینٹھا کہ وہ ''آہ مرا آہ مرا'' کہتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ اب بجرنگی آپے سے باہر ہو گیا۔ جھپٹ کر ایسی لاٹھی ماری کہ طاہر علی تیورا کر گر پڑے۔ کئی چمار

جواب تک اسے لڑکوں کا جھگڑا سمجھ کر چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ طاہر علی کو گرتے دیکھ کر دوڑے اور بجرنگی کو پکڑ لیا۔ میدان کارزار میں سناٹا چھا گیا۔ ہاں زینب اور رقیہ دروازہ پر کھڑی ہوئیں لفظی تیروں سے برابر کام لے رہی تھیں۔ ''مونڈی کاٹے نے غضب کر دیا۔ اس پر خدا کا قہر نازل ہو۔ اگلا دن دیکھنا نصیب نہ ہو۔ اس کی میت اٹھے۔ کوئی دوڑتے ہوئے صاحب کے پاس جا کر کیوں اطلاع نہیں دیتا۔ ارے او چمارو! بیٹھے منہ کیا تاکتے ہو؟ جا کر صاحب کو خبر کیوں نہیں دیتے؟ کہنا ابھی چلیے۔ ساتھ لانا۔ کہنا پولیس لیتے چلیے۔ یہاں جان دینے نہیں آئے ہیں۔''

بجرنگی نے طاہر علی کو گرتے دیکھا تو سنبھل گیا۔ دوسرا ہاتھ نہ چھوڑا۔ گھیسو کا ہاتھ پکڑا اور گھر چلا گیا۔ یہاں گھر میں کہرام مچ گیا۔ دو چمار جان سیوک کے بنگلہ کی طرف گئے۔ طاہر علی کو لوگوں نے اٹھایا اور چارپائی پر لا کر کمرہ میں لائے۔ کندھے پر لاٹھی لگی تھی۔ شاید ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ابھی تک بے ہوش تھے۔ چماروں نے فوراً ہلدی پیسی اور اسے گڑ چونے میں ملا کر ان کے کندھے پر لگایا۔ ایک آدمی لپک کر ارنڈ کے پتے توڑ لایا۔ دو آدمی بیٹھ کر چوٹ سینکنے لگے۔ زینب اور رقیہ تو ماہر علی کی مرہم پٹی کرنے لگیں۔ بیچاری کلثوم دروازہ پر کھڑی رو رہی تھی۔ شوہر کی طرف اس سے دیکھا بھی نہ جاتا تھا۔ گرنے سے ان کے سر پر چوٹ آ گئی تھی۔ خون بہہ کر ماتھے پر جم گیا تھا۔ بالوں پر لٹیں پڑ گئی تھیں۔ گویا کسی مصور کے برش پر رنگ خشک ہو گیا۔ دل میں درد ہو رہا تھا لیکن شوہر کو دیکھتے ہی اس کو بے ہوشی سی ہونے لگتی تھی۔ یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ یہ سب لوگ اپنے دل میں کیا کہتے ہوں گے۔ اس کو شوہر سے ذرا بھی محبت نہیں۔ کھڑی تماشا دیکھ رہی ہے۔ کیا کروں؟ ان کا چہرہ نہ جانے کیسا ہو گیا ہے۔ وہی چہرہ جس کی کبھی بلائیں لی جاتی تھیں۔ مرنے کے بعد خوف ناک ہو جاتا ہے۔ اس کی طرف نگاہ کرنے کے لیے کلیجہ کو مضبوط بنانا پڑتا ہے۔ زندگی کی طرح موت کا بھی سب سے زیادہ نمایاں اثر چہرہ پر ہی پڑتا ہے۔ طاہر علی کی دن بھر

سینک باندھ ہوئی۔ چماروں نے اس طرح دوڑ دھوپ کی۔ گویا ان کا کوئی خاص دوست ہو۔ عملی ہمدردی کا ہونا دہقانوں کا ایک خاص وصف ہے۔ رات کو بھی کئی چماران کے پاس بیٹھے ہوئے سینکتے باندھتے رہے۔ زینب اور رقیہ بار بار کلثوم کو طعنے دیتیں۔ ''بہن تمہارا دل بھی غضب کا ہے۔ وہاں شوہر کا برا حال ہو رہا ہے اور تم یہاں مزہ سے بیٹھی ہو۔ ہمارے میاں کے سر میں ذرا سا درد ہوتا تھا تو ہماری جان نا خون میں آ جاتی تھی۔ آج کل کی عورتوں کا کلیجہ سچ مچ پتھر کا ہوتا ہے۔'' کلثوم کا دل ان تیروں سے چھدا جاتا تھا مگر یہ کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ تمہیں دونوں کیوں نہیں چلی جاتیں؟ آخر تم بھی تو انہیں کی کمائی کھاتی ہو اور مجھ سے زیادہ۔ لیکن اتنا کہتی تو بچ کر کہاں جاتی۔ دونوں اس کے گلے پڑ جاتیں۔ بیچاری ساری رات جاگتی رہی۔ بار بار دروازہ پر جا کر آہٹ لے آتی تھی۔ کسی طرح رات گئی۔ صبح طاہر علی کی آنکھ کھلی۔ درد سے اب بھی کراہ رہے تھے مگر اب ان کی حالت اس قدر تشویش انگیز نہ تھی۔ تکیہ کے سہارے بیٹھ گئے۔ کلثوم نے ان کو چماروں سے باتیں کرتے سنا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ان کی آواز کچھ تبدیل ہو گئی ہے۔ چماروں نے جونہی انہیں ہوش میں دیکھا، سمجھ گئے کہ اب ہماری ضرورت نہیں رہی۔ اب گھر والوں کی تیمارداری کا وقت آ گیا۔ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ اب کلثوم نے دل کو مضبوط کیا اور شوہر کے پاس آ بیٹھی۔ طاہر علی نے اس کو دیکھا تو کمزور آواز میں بولے۔ ''خدا نے مجھے نمک حرامی کی سزا دی ہے۔ جن کے لیے اپنے آقا کا برا چیتا وہی اپنے دشمن ہو گئے۔

کلثوم: تم یہ ملازمت چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ جب تک زمین کا معاملہ طے ہو جائے گا نت نیا جھگڑا ہوتا ہی رہے گا۔ لوگوں سے دشمنی بڑھتی جائے گی۔ یہاں جان تھوڑا ہی دینی ہے۔ خدا جانے جس طرح اتنے دن رزق دیا اسی طرح آگے بھی دے گا۔ جان تو سلامت رہے گی۔

طاہر: جان تو سلامت رہے گی مگر گذر کیسے ہو گی؟ کون اتنا دیئے دیتا ہے؟ دیکھتی

ہو کہ اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ مارے مارے پھرتے ہیں۔

کلثوم: نہ اتنا ملے گا نہ سہی۔ اس کا نصف تو ملے گا۔ دونوں وقت نہ کھائیں گے۔ ایک ہی وقت سہی۔ جان تو آفت میں نہ رہے گی۔

طاہر: تم ایک وقت کھا کر خوش رہو گی۔ گھر میں اور لوگ بھی تو ہیں۔ ان کے دکھڑے روز کون سنے گا۔ مجھے اپنی جان سے دشمنی تھوڑا ہی ہے۔ پر مجبور ہوں۔ خدا کو جو منظور ہے، وہی ہو گا۔

کلثوم: گھر کے اور لوگوں کے پیچھے جان دے دو گے؟

طاہر: کیسی باتیں کرتی ہو۔ آخر وہ لوگ کوئی غیر تو نہیں ہیں۔ اپنے ہی بھائی ہیں یا مائیں ہیں۔ ان کی پرورش میرے سوا اور کون کرے گا؟

کلثوم: تم سمجھتے ہو گے وہ لوگ تمہارے محتاج ہیں مگر ان کو تمہاری رتی برابر بھی پروا نہیں ہے۔ جب تک مفت ملے اپنے خزانہ میں کیوں ہاتھ لگائیں۔ میرے بچے پیسے پیسے کو ترستے ہیں اور وہاں مٹھائیوں کی ہانڈیاں آتی ہیں۔ ان کے لڑکے مزہ میں کھاتے ہیں۔ دیکھتی ہوں اور آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔

طاہر: میرا جو فرض ہے، اسے پورا کرتا ہوں۔ اگر ان کے پاس روپے ہیں تو اس کا مجھے کیوں افسوس ہو۔ وہ شوق سے کھائیں اور آرام سے رہیں۔ تمہاری باتوں سے حسد کی بو آتی ہے۔ خدا کے لیے مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کرو۔

کلثوم: پچھتاؤ گے۔ جب سمجھاتی ہوں مجھی پر ناراض ہوتے ہو، لیکن دیکھ لینا کوئی بات نہ پوچھے گا۔

طاہر: یہ سب تمہاری نیت کا قصور ہے۔

کلثوم: ہاں عورت ہوں۔ مجھ میں عقل کہاں۔ پڑے تو ہو کسی نے جھانکا تک نہیں۔ قلق ہوتا تو یوں چین سے نہ بیٹھی رہتیں۔

طاہر علی نے کروٹ بدلی تو کندھے پر شدت کا درد محسوس ہوا۔ آہ آہ کر کے چیخ

اٹھے۔ ماتھے پر پسینہ آ گیا، کلثوم گھبرا کر بولی۔ ''کسی کو بھیج کر ڈاکٹر کو کیوں نہیں بلا لیتے؟ کہیں ہڈی پر ضرب نہ آ گئی ہو۔''

طاہر: ہاں مجھے بھی ایسا ہی اندیشہ ہو رہا ہے مگر ڈاکٹر کو بلاؤں تو اس کی فیس کے روپے کہاں سے آویں گے؟

کلثوم: تنخواہ تو ابھی ملی تھی۔ کیا اتنی جلدی خرچ ہو گئی؟

طاہر: خرچ تو نہیں ہو گئی لیکن فیس کی گنجائش نہیں ہے۔ اب کے ماہر کی تین ماہ کی فیس دینی ہو گی۔ بارہ روپے تو فیس ہی کے نکل جائیں گے۔ صرف اٹھارہ بچیں گے۔ ابھی تو پورا مہینہ پڑا ہوا ہے۔ کیا فاقہ کریں گے؟

کلثوم: جب دیکھو ماہر کی فیس کا تقاضا سر پر سوار رہتا ہے۔ ابھی دس دن ہوئے فیس نہیں دی گئی۔

طاہر: دس دن نہیں ہوئے۔ ایک مہینہ ہو گیا۔

کلثوم: فیس اب کے نہ جائے گی۔ ڈاکٹر کی فیس اس فیس سے زیادہ ضروری ہے۔ وہ پڑھ کر روپے کمائی گے تو میرا گھر نہ بھریں گے۔ مجھے تو تمہاری ہی ذات کا بھروسہ ہے۔

طاہر: (بات بدل کر) ان موذیوں کی جب تک بخوبی تنبیہ نہ ہو جائے گی۔ شرارت سے باز نہ آئیں گے۔

کلثوم: ساری شرارت اسی ماہر کی تھی۔ لڑکوں میں لڑائی جھگڑا ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہ وہاں نہ جاتا تو کیوں معاملہ اتنا طول کھینچتا۔ اس پر جواہیر کے لونڈے نے ذرا دانت کاٹ لیا تو آپ بھنا اٹھے۔

طاہر: مجھے تو خون کے چھینٹے دیکھتے ہی جیسے سر پر شیطان سوار ہو گیا۔

اتنے میں گھیسو کی ماں جمنی آ پہنچی۔ زینب نے اسے دیکھتے ہی فوراً بلا لیا اور ڈانٹ کر کہا: ''معلوم ہوتا ہے تیری شامت آ گئی ہے۔''

جمنی: بیگم صاحب! شامت نہیں آئی ہے۔ برے دن آئے ہیں اور کیا کہوں۔ میں کل دہی بیچ کر لوٹی تو یہ حال سنا۔ سیدھے آپ کی کھدمت (خدمت) میں دوڑی۔ پر یہاں بہت آدمی جمع تھے۔ لاج کے مارے لوٹ گئی۔ آج دہی بیچنے نہیں گئی۔ بہت ڈرتے ڈرتے آئی ہوں۔ جو کچھ بھول چوک ہوئی، اسے معاف کیجیے۔ نہیں تو اجڑ جائیں گے۔ کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔

زینب: اب ہمارے کیے کچھ نہیں ہوسکتا۔ صاحب بلا مقدمہ چلائے نہ مانیں گے اور وہ نہ چلائیں گے تو ہم چلائیں گے۔ ہم کوئی دھنیے جلاہے ہیں۔ یوں سب سے دبتے پھریں تو عزت کیسے رہے۔ میاں کے باپ تھانہ دار تھے۔ سارا علاقہ ان کے نام سے کانپتا تھا۔ بڑے بڑے رئیس ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ ان کی اولاد کیا اب ایسی گئی گذری ہوگئی کہ چھوٹے چھوٹے آدمی بے عزتی کریں۔ تیرے لونڈے نے ماہر کو اتنے زور سے دانت سے کاٹا کہ لہولہان ہوگیا۔ پٹی باندھے پڑا ہے۔ تیرے شوہر نے آکر لڑکے کو ڈانٹ دیا ہوتا تو بگڑی بات بن جاتی، لیکن اس نے تو آتے ہی لاٹھی چلا دی۔ ہم شریف لوگ ہیں۔ اتنی رعایت نہیں کر سکتے۔

رقیہ: جب پولیس آکر مارتے مارتے کچومر نکال لے گی۔ تب ہوش آئے گا۔ نذو ونیاز دینا پڑے گی وہ الگ۔ جبھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔

جمنی کو اپنے شوہر کے غصہ کی عملی واقفیت حاصل تھی۔ ان دھمکیوں سے ذرا بھی نہ ڈری۔ بولی: ''بیگم صاحب یہاں اتنے روپے کہاں دھرے ہیں۔ دودھ پانی کر کے دس پانچ روپے اکٹھے کیے ہیں بس وہیں تک اپنی دوڑ ہے۔ اس روزگار میں اب کیا رکھا ہے۔ روپیہ کا تین پنسیری تو بھوسہ ملتا ہے۔ ایک روپیہ میں ایک بھینس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ اس پر کھلی، بنولہ، بھوسی، چوکر سبھی کچھ چاہیے۔ کسی طرح دن کاٹ رہے ہیں۔ آپ کے بال بچوں کو سال چھ مہینے دودھ پلا دوں گی۔''

زینب سمجھ گئی کہ یہ اہیرن کچی گولی نہیں کھیلی ہے اس کے لیے کسی دوسرے ہی منتر سے کام لینا پڑے گا۔ ناک سکوڑتے ہوئی بولی۔ ''تو اپنا دودھ اپنے گھر رکھ۔ یہاں دودھ گھی کے ایسے بھوکے نہیں ہیں۔ یہ زمین اپنی ہوئی جاتی ہے۔ جتنے مویشی چاہوں گی پال لوں گی۔ مگر تجھے کہے دیتی ہوں کہ تو گھر میں کل سے نہ بیٹھنے پائے گی۔ پولیس کی رپٹ تو صاحب کے ہاتھ میں ہے، پر ہمیں بھی خدا نے ایسا علم دیا ہے کہ جہاں ایک نقش لکھ کر دم کیا، جنات اپنا کام کرنے لگے۔ جب ہمارے میاں زندہ تھے تو ایک بار پولیس کے ایک بڑے انگریز حاکم سے کچھ حجت ہوگئی۔ بولا ہم تم کو نکال دیں گے۔ میاں نے آ کر مجھ سے کہا۔ میں نے اسی رات سلیمانی نقش لکھ کر دم کیا۔ اس کی میم کا پورا حمل گر گیا۔ دوڑا ہوا آیا۔ خوشامدیں کیں۔ پیروں پر گرا۔ میاں سے قصور معاف کرایا۔ تب میم کی جان بچی۔ کیوں رقیہ تمہیں یاد ہے نا؟''

رقیہ: یاد کیوں نہیں ہے۔ میں نے ہی تو دعا پڑھی تھی۔ صاحب رات بھر دروازہ پر پکارتا رہا تھا۔

زینب: ہم اپنی طرف سے کسی کی برائی نہیں چاہتے لیکن جب جان پر آ بنتی ہے تو سبق بھی ایسا دیتے ہیں کہ زندگی بھر نہ بھولے۔ ابھی اپنے پیر سے کہہ دیں تو خدا جانے کیا غضب ڈھائیں۔ تمہیں تو یاد ہے رقیہ؟ ایک اہیر نے انہیں دودھ میں پانی ملا کر دیا تھا۔ ان کی زبان سے اتنا ہی نکلا۔ ''جا تجھے خدا سمجھے۔'' اہیر نے گھر آ کر دیکھا تو اس کی دوسو روپے کی بھینس مر گئی تھی۔

جمنی نے یہ باتیں سنی تو ہوش اڑ گئے۔ دوسری عورتوں کی طرح وہ بھی تھانہ، پولیس، کچہری اور دربار کی بہ نسبت بھوت پریت سے زیادہ خوف زدہ رہتی تھی۔ پاس پڑوس میں بھوتوں کی لیلا دیکھنے کے موقعے آئے دن ملتے ہی رہتے تھے۔ ملاؤں کے جنتر منتر کہیں زیادہ لاگو ہوتے تھے ہیں، یہ بھی جانتی تھی۔ زینب نے اس کے شیطانی خوف کو محرک کر کے اپنی کمال ہوشیاری کا ثبوت دیا۔ جمنی ڈر کر بولی۔

''نہیں بیگم صاحب آپ کو بھی بھگوان نے بال بچے دیئے ہیں، ایسا ظلم نہ کیجیے گا۔ نہیں تو مر جاؤں گی۔''

زینب: یہ بھی نہ کریں وہ بھی نہ کریں تو عزت کیسے رہے۔ کل کو تیرا اہیر پھر لٹھ لے کر آ پہنچے تو؟ خدا نے چاہا تو اب وہ لٹھ اٹھانے لایق رہ نہ جائے گا۔

جمنی کانپتی ہوئی پیروں پر گر پڑی اور بولی۔ ''بی بی جو حکم ہو، اس کے لیے حاضر ہوں۔''

زینب نے چوٹ پر چوٹ لگائی اور جمنی کے بہت رونے گڑگڑانے پر پچیس روپے لے کر جنات سے اس کو بے خوف کیا۔ جمنی گھر گئی۔ روپے لا کر دیئے اور پیروں پر گری۔ مگر بجرنگی سے یہ بات نہ کہی۔ وہ چلی گئی تو زینب نے ہنس کر کہا۔ ''خدا دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ اس کا وہم گمان بھی نہ تھا۔ تم بے صبر ہو جاتی ہو ورنہ میں نے کچھ نہ کچھ اور اینٹھا ہوتا۔ سوار کو چاہیے کہ باگ ہمیشہ کڑی رکھے۔''

دفعتاً صابر نے آ کر زینب سے کہا۔ ''آپ کو ابا بلاتے ہیں۔'' زینب وہاں گئی تو طاہر علی کو پڑے کراہتے دیکھا کلثوم سے بولی۔ ''بی بی غضب کا تمہارا جگر ہے۔ ارے بھلے آدمی! جا کر ذرا مونگ کا دلیا پکا دے۔ غریب نے رات کو کچھ نہیں کھایا۔ اس وقت بھی منہ میں کچھ نہ جائے گا۔ تو کیا حال ہوگا؟''

طاہر: نہیں۔ میرا کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ آپ کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ اگر آپ کے پاس کچھ روپے ہوں تو مجھے قرض کے طور پر دے دیجیے۔ میرے شانوں میں درد ہے۔ شاید ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ ڈاکٹر کو دکھلانا چاہتا ہوں مگر اس کی فیس کے لیے روپوں کی ضرورت ہے۔

زینب: بیٹا۔ بھلا سوچو تو میرے پاس روپے کہاں سے آئے؟ تمہارے سر کی قسم کھا کر کہتی ہوں مگر تم ڈاکٹر کو بلاتے ہی کیوں ہو؟ تمہیں سیدھے صاحب کے یہاں جانا چاہیے۔ یہ ہنگامہ انہیں کی بدولت تو ہوا ہے ورنہ یہاں ہم کو کسی سے کیا غرض

تھی؟ ایک یکہ منگوالو اور صاحب کے یہاں چلے جاؤ۔ وہ ایک رقعہ لکھ دیں گے تو سرکاری شفاخانہ میں خاصی طرح علاج ہو جائے گا۔ تمہیں سوچو ہماری حیثیت ڈاکٹر بلانے کی ہے؟

طاہر علی کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ ماں کا شکریہ ادا کیا۔ سوچا نہ جانے یہی بات میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی۔ یکہ منگوایا۔ لاٹھی کے سہارے بڑی مشکل سے اس پر سوار ہوئے اور صاحب کے بنگلہ پر پہنچے۔

مسٹر سیوک، راجہ مہیندر کمار سے ملنے کے بعد کمپنی کے حصص بیچنے کے لیے باہر چلے گئے تھے۔ کل وہ راجہ صاحب سے پھر ملے تھے مگر جب ان کا فیصلہ سنا تو بہت مایوس ہوئے۔ بہت دیر تک بیٹھے بحث مباحثہ کرتے رہے لیکن راجہ صاحب نے کوئی اطمینان بخش جواب نہ دیا۔ ناامید ہو کر آئے اور مسز سیوک کو سارا حال سنایا۔

مسز سیوک کو ہندوستانیوں سے چڑ تھی۔ اگرچہ اسی ملک کے آب و گل سے ان کا جسم بنا تھا، لیکن اپنے خیال میں مذہب عیسوی کو اختیار کر کے وہ ان بداطواریوں سے نجات پا چکی تھیں جو ہندوستانیوں کے لیے مخصوص ہیں۔ ان کے خیال میں خدا نے ہندوستانیوں کو شرافت، ہمدردی، فیاضی، انسانیت وغیرہ اعلیٰ اوصاف سے بالکل ہی محروم رکھا تھا۔ وہ مغربی تہذیب کی معتقد تھیں اور طرز معاشرت میں اسی کی تقلید کرتی تھیں۔ کھانا پینا، وضع قطع، بود و باش سب انگریزی تھی۔ مجبوری صرف اپنے سانولے رنگ سے تھی۔ صابن اور دیگر کیمیاوی اشیاء کے متواتر استعمال سے بھی دلی مراد بر نہ آتی تھی۔ ان کی زندگی کا اعلیٰ مقصد یہی تھا کہ ہم عیسائیوں کے درجہ سے نکل کر انگریزوں سے مل جائیں۔ ہمیں لوگ صاحب سمجھیں۔ ہمارا ربط ضبط انگریزوں سے ہو۔ ہمارے لڑکوں کی شادیاں اینگلو انڈین یا کم از کم اعلیٰ طبقہ والے یوروشین لوگوں کے یہاں ہوں۔ صوفیہ کی تعلیم و تربیت انگریزی طریقہ پر ہوئی تھی، لیکن وہ ماں کے بہت اصرار کرنے پر بھی انگریزی پارٹیوں اور دعوتوں میں

نہ شریک ہوتی تھی۔ ناچ سے تو اس کو نفرت ہی تھی، لیکن مسز سیوک ان مواقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھیں۔ یوں کام نہ چلتا تو خاص کر کوشش کر کے دعوتی کارڈ منگواتیں تھیں۔ اگر خود ان کے گھر پر دعوتیں اور پارٹیاں بہت کم ہوتی تھیں تو اس کا سبب تھا ایشور سیوک کی کنجوسی۔

یہ حال سن کر مسز سیوک نے کہا: دیکھ لی ہندوستانیوں کی شرافت؟ پھولے نہ سماتے تھے۔ اب تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ کس قدر بد عہد اور نا اہل ہیں؟ ایک اندھے فقیر کے مقابلہ میں تمہاری یہ قدر ہے! جانبداری تو ان لوگوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ یہ ان بڑے بڑے آدمیوں کا حال ہے جو اپنی قوم کے رہنما سمجھے جاتے ہیں۔ جن کی فیاضی پر لوگوں کو ناز ہے! میں نے ایک بار مسٹر کلارک سے یہ ذکر کیا تھا انہوں نے تحصیل داروں کو حکم دے دیا کہ اپنے اپنے علاقہ میں تمباکو کی پیداوار بڑھاؤ۔ یہ صوفی کے آگ میں کودنے کا انعام ہے۔ ذرا سا میونسپلٹی کا اختیار کیا مل گیا۔ سبھوں کے دماغ پھر گئے۔ مسٹر کلارک کہتے تھے کہ اگر راجہ صاحب زمین کا معاملہ طے کریں گے تو میں اسے ضابطہ سے آپ کو دلا دوں گا۔

مسٹر کلارک حاکم ضلع تھے۔ ابھی تھوڑے ہی دنوں سے یہاں آئے تھے۔ مسز سیوک نے ان سے ربط ضبط پیدا کر لیا تھا۔ دراصل انہوں نے کلارک کو صوفی کے لیے منتخب کیا تھا۔ دو ایک دفعہ انہیں اپنے گھر بھی بلا چکی تھیں۔ گھر چھوڑ دینے سے پیشتر صوفی کی ان سے دو تین بار ملاقات بھی ہو چکی تھی، مگر وہ ان کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہوئی تھی، تو بھی مسز سیوک ابھی اس بارے میں نا امید نہیں ہو چکی تھیں۔ کلارک سے کہتی رہتی تھیں کہ صوفی مہمانی کرنے گئی ہے۔ اسی طرح موقع پا کر ان کی آتش عشق کو مشتعل کرتی رہتی تھی۔

جان سیوک نے نادم ہو کر کہا۔ ''میں کیا جانتا تھا کہ یہ حضرت بھی دغا دیں گے۔ یہاں ان کی بڑی شہرت ہے۔ اپنے قول کے پکے سمجھے جاتے ہیں۔ خیر کچھ مضائقہ

نہیں۔ اب کوئی دوسری تدبیر سوچنی پڑے گی۔''

مسز سیوک: میں مسٹر کلارک سے کہوں گی۔ پادری صاحب سے سفارش کراؤں گی۔

جان سیوک: مسٹر کلارک کو میونسپلٹی کے معاملات میں دخل دینے کا اختیار نہیں ہے۔

جان سیوک اسی اندیشہ میں غرق تھے کہ ان کو ہنگامہ کی خبر ملی۔ سناٹے میں آ گئے۔ پولیس میں رپورٹ کی۔ دوسرے روز گودام جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ طاہر علی لاٹھی ٹیکتے ہوئے آ پہنچے۔ آتے ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ یکہ کے ہچکولوں نے ادھ موا سا کر دیا تھا۔

مسز سیوک نے انگریزی میں کہا: کیسی صورت بنا لی ہے۔ گویا مصیبت کا پہاڑ پھٹ پڑا ہے۔

جان سیوک: کہیے منشی جی! معلوم ہوتا ہے آپ کے سخت چوٹ آئی۔ مجھے اس کا بےحد افسوس ہے۔

طاہر: حضور کچھ نہ پوچھیے۔ کم بختوں نے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہ رکھ چھوڑی تھی۔

جان سیوک: اور انہیں مفسدوں کی آپ مجھ سے سفارش کر رہے تھے!

طاہر: حضور! اپنی خطا کی خوب سزا پا چکا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے میری گردن کی ہڈی پر ضرب آ گئی ہے۔

جان سیوک: یہ آپ کی خام خیالی ہے۔ ہڈی ٹوٹ جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آپ یہاں کسی طرح نہ آ سکتے تھے۔ چوٹ ضرور آئی ہے مگر دو چار روز مالش کر لینے سے صحت ہو جائے گی۔ آخر یہ مار پیٹ ہوئی کیوں؟

طاہر: حضور! یہ سب اسی شیطان بجرنگی اہیر کی حرکت ہے۔

جان سیوک: مگر مضروب ہو جانے ہی سے آپ جرم سے بری نہیں ہو سکتے۔ میں

اس کو آپ کی نادانی اور بے احتیاطی سمجھتا ہوں۔ آپ ایسے لوگوں سے الجھے ہی کیوں؟ آپ کو معلوم ہے۔ اس میں میری کتنی بدنامی ہے؟

طاہر: میری طرف سے تو کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔

جان سیوک: ضرور ہوئی ورنہ دیہاتیوں کے آدمی کسی سے چھیڑ کر لڑنے نہیں آتے۔ آپ کو اس طرح رہنا چاہیے کہ لوگوں پر آپ کا رعب رہے۔ یہ نہیں کہ چھوٹے چھوٹے آدمیوں کو آپ سے مار پیٹ کرنے کی ہمت ہو۔

مسز سیوک: کچھ نہیں۔ یہ سب ان کی کمزوری ہے۔ کوئی راہ چلتے کسی کو نہیں مارتا۔

ایشور سیوک کرسی پر پڑے پڑے بولے: خدا کے بیٹے! مجھے اپنے سایہ میں لے۔ سچے دل سے اس کی بندگی نہ کرنے کی یہی سزا ہے۔

طاہر علی کو یہ باتیں زخم پر نمک کی طرح معلوم ہوئیں۔ ایسا غصہ آیا کہ اسی وقت کہہ دوں۔ جہنم میں جائے تمہاری نوکری، لیکن جان سیوک کو ان کی خستہ حالی سے فائدہ اٹھانے کی ایک تدبیر سوجھ گئی۔ فٹن تیار کرائی اور طاہر علی کو لیے ہوئے راجہ مہیند رکمار کے مکان پر جا پہنچے۔ راجہ صاحب شہر کا گشت لگا کر مکان پر پہنچے ہی تھے کہ جان سیوک کا کارڈ ملا۔ کچھ جھنجھلائے، لیکن مروت دامن گیر ہوئی۔ باہر نکل آئے۔ مسٹر سیوک نے کہا ''معاف کیجیے گا۔ میں نے آپ کو بے وقت تکلیف دی مگر پانڈے پور والوں نے اتنا فساد برپا کر رکھا ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کے سوا کس کا دامن پکڑوں۔ کل سب نے مل کر گودام پر حملہ کر دیا۔ شاید آگ لگا دینا چاہتے تھے، پر آگ تو نہ لگا سکے۔ ہاں یہ میرے ایجنٹ ہیں۔ بس سب کے سب ان پر ٹوٹ پڑے۔ ان کو اور ان کے بھائیوں کو مارتے مارتے بے دم کر دیا۔ اتنے پر بھی ان کو تسکین نہ ہوئی۔ زنانہ مکان میں گھس گئے اور اگر عورتیں اندر سے دروازہ نہ بند کر لیں تو ان کی آبروریزی میں کوئی شک نہ تھا۔ ان کو تو ایسی چوٹیں لگی ہیں کہ شاید مہینوں تک چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوں۔ کندھے کی ہڈی ہی ٹوٹ گئی ہے۔''

مہیندر رکمار سنگھ عورتوں کی بہت عزت کرتے تھے۔ان کی بے عزتی ہوتے دیکھ کر طیش میں آ جاتے تھے۔غضب ناک ہوکر بولے۔''سب زنانہ میں گھس گئے؟''

جان سیوک: کواڑتو ڑنا چاہتے تھے مگر چماروں نے دھمکایا تو ہٹ گئے۔

مہیندر رکمار: کمینے! عورتوں پر ظلم کرنا چاہتے تھے!

جان سیوک: یہی تو اس ڈراما (ناٹک) کا سب سے زیادہ شرمناک حصہ ہے۔

مہیندر رکمار: شرم ناک نہیں۔صاحب! قابل نفرین کہیے۔

جان سیوک: اب یہ بے چارے کہتے ہیں کہ یا تو میرا استعفیٰ لیجیے یا گودام کی حفاظت کے لیے چوکیداروں کا بندوبست کیجیے۔عورتیں اس قدر خوف زدہ ہیں کہ وہاں ایک منٹ بھی نہیں رہنا چاہتیں۔یہ ساری باتیں اسی اندھے کی بدولت ہو رہی ہیں۔

مہیندر رکمار: مجھے تو وہ بہت ہی غریب اور سیدھا سا آدمی معلوم ہوتا ہے مگر ہے چھٹا ہوا! میں نے اسی کی بیچارگی پر ترس کھا کر تجویز کیا تھا کہ آپ کے لیے کوئی دوسری زمین تلاش کروں، لیکن جب ان لوگوں نے شرارت پر کمر باندھی ہے اور آپ کو وہاں سے جبراً ہٹانا چاہتے ہیں تو اس کی سزا انہیں ضرور ملے گی۔

جان سیوک: بس یہی بات ہے۔وہ لوگ مجھے وہاں سے نکال دینا چاہتے ہیں۔ اگر رعایت کی گئی تو میرے گودام میں ضرور آگ لگا دیں گے۔

مہیندر رکمار: میں خوب سمجھ رہا ہوں۔یوں میں خود جمہوریت کا دلدادہ ہوں اور اس کے اصول کی دل و جان سے حمایت کرتا ہوں، لیکن جمہوریت کے نام پر ملک میں جو بدامنی پھیلی ہوئی ہے، اس کا میں ایک زبردست مخالف ہوں۔ایسی جمہوریت سے تو سرمایہ داری یا شخصی اقتدار وغیرہ سبھی بہتر ہیں۔آپ مطمئن رہیے۔

اسی طرح کچھ دیر اور باتیں کر کے اور راجہ صاحب کو خوب بھر کے جان سیوک رخصت ہوئے۔راستہ میں طاہر علی سوچنے لگے۔صاحب کو میری بدحالی سے اپنا

کام نکالنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوا۔ کیا ایسے صاحب ثروت، باعزت، ذہین اور ذی علم لوگ ایسے خودغرض ہوتے ہیں؟

جان سیوک نے قیافہ سے ان کے خیالات کو معلوم کرلیا۔ بولے۔ ''آپ سوچ رہے ہوں گے۔ میں نے اس قدر مبالغہ اور رنگ آمیزی کیوں کی۔ صرف سانحہ کا واقعہ حال ہی کیوں نہ بیان کیا، لیکن سوچیے کہ کیا ایسی صورت میں مجھے یہ نتیجہ حاصل ہوسکتا؟ دنیا میں کسی کام کا اچھا یا برا ہونا محض کامیابی پر محمول ہے۔ ایک شخص حکومت سے بغاوت کرتا ہے۔ اگر حکام نے اس پر تشدد کرنے کا موقع پالیا تو وہ باغی کہا جاتا ہے اور سزائے موت پاتا ہے۔ اگر اس کا مقصد پورا ہوگیا تو وہ اپنے ملک کا نجات دہندہ اور فاتح سمجھا جاتا ہے اور اس کی یادگاریں قائم کی جاتی ہیں۔ کامیابی میں عیوب کے مٹادینے کی عجیب قوت ہے۔ آپ جانتے ہیں دو سال پہلے مصطفیٰ کمال نے کیا تھا؟ باغی! ملک اس کے خون کا پیاسا تھا۔ آج وہ اپنی قوم کا روح رواں ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ کامیاب ہوا۔ لینن کئی سال قبل اپنی جان کے خوف سے امریکہ بھاگ گیا تھا۔ آج وہ جمہور روس کا پریذیڈنٹ ہے۔ یہ محض اس لیے کہ اس کی بغاوت کامیاب ہوئی۔ میں نے راجہ صاحب کو طرفدار بنالیا پھر مبالغہ کا عیب کہاں رہا؟''

اتنے میں فٹن بنگلہ پر آ پہنچی۔ ایشور سیوک نے آتے ہی پوچھا۔ ''کہو کیا کر آئے؟''

جان سیوک نے فخر سے کہا۔ ''راجہ کو اپنا مرید بنالیا۔ تھوڑی سی رنگ آمیزی تو ضرور کرنی پڑی، پر اس کا اثر بہت اچھا ہوا۔''

ایشور سیوک: خدا تجھ پر رحم کی نگاہ رکھے۔ بیٹا! رنگ آمیزی بغیر بھی دنیا کا کوئی کام چلتا ہے؟ کامیابی کی یہی کنجی ہے اور تجارتی کامیابی کے لیے تو اس کا ہونا اور بھی ضروری ہے۔ آپ کے پاس اچھی سے اچھی چیز ہے۔ جب تک آپ اس کی